اظہر علی سیّد
ورک سٹریٹ نئی آبادی ریلوے روڈ کوٹ رادھا کشن، ضلع قصور

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اُردو ادب کی تاریخ'' کا تکنیکی مطالعہ

Azhar Ali Syed
Work Street nai Aabadi Railway road Kot Radha Kishan, Distt Kasur

Anylitical Study of Dr Tabassum Kaashmiri "History of Urdu literature"

History of Urdu literature was written firstly by Muhammed Hussain Azad .Then many Urdu literary historians contributed. The latest and important history work of Urdu literature was written by Dr Tabassum Kaashmiri,which is being widely appreciated in literary circles. In this article the book is thoroughly analyzed and highlighted prominent aspects.

اکیسویں صدی نے جہاں تمام شعبہ ہائے زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے، وہاں علم و ادب اور ہنر کے میدانوں میں بھی ایسی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ جس نے اندازِ فکر اور طریقِ کار کو بھی یکسر بدل دیا ہے۔ اس سے جہاں ادب کے تقاضوں میں تبدیلیاں رونما ہوئیہیں وہاں ادب کے معیارات بھی بدل گئے ہیں۔ ادب جو مسلسل ارتقا پذیر رہتا ہے، اس کی تاریخ میں بھی ارتقائی تبدیلیوں کا ظہور لازمی امر ٹھہرتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ نویسی کی روایت جس کا آغاز محمد حسین آزاد کی '' آبِ حیات'' (۱۸۸۰ء) سے ہوتا ہے، اس روایت نے بیسویں صدی میں فروغ حاصل کیا اور بیسویں صدی کے اختتام تک، یہ ادبی تاریخ نویسی کی روایت اپنے دامن میں بہت معقول اثاثہ رکھتی تھی۔

اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں اُردو ادب کی تاریخ نویسی کی روایت میں ایک نیا اضافہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اُردو ادب کی تاریخ'' (۲۰۰۳ء) کیصورت میں منظر عام پر آتا ہے۔ دنیائے اُردو ادب میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا نام ایک منفرد انداز اور مقام کا حاملہے اور اب ''اردو ادب کی تاریخ'' کی تشکیلکے بعد، ان کا شمار اردو ادب کے ادبی مورخین میں ہونے لگا ہے۔

ادبی تاریخ کیا ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب سے پہلے ہمیں اس بات کا بخوبی فہم ہونا چاہیے۔ کہ تاریخ کیا ہے؟ لغت میں تاریخ کے معنی ہیں ''وہ علم جس سے ماضی و حال کے واقعات سے بحث کی جاتی ہے''۔(۱) علمائے علمِ تاریخ نے اصطلاحاً اس کے معنی کچھ یوں متعین کیے ہیں کہ ''وقت بتا کر احوال متعین کرنا''، ''ماضی میں ہونے والے واقعات جنہوں نے تاریخ میں کوئی تبدیلی کی ہو یا جن کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی اہمیت ہو؛ ایسے واقعات کی ترتیب و تدوین کر کے انہیں سنہ وار بیان کرنا، تاریخ کے دائرے میں آتا ہے۔''(۲)

علمِ تاریخ کے معنی و مفہوم اور تعریف کے تعین بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ ادبی تاریخ کیا ہوتی ہے؟ ادبی تاریخ بھی بنیادی طور پر ایک تاریخ ہی ہوتی ہے لیکن یہ ایسی تاریخ ہوتی ہے کہ جس میں ''بنیادی اہمیت تو ادب ہی کو حاصل ہوتی ہے مگر ادب پر اثر انداز ہونے والے دیگر

عوامل اور محرکات کا مطالعہ بھی ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔'' (۳)

ادبی تاریخ نویسی کا عمل بنیادی طور پر تین عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔ اول۔۔ واقعات، دوم۔۔ واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے شہادتوں کی صورت میں ماخذات کی تلاش (تحقیق) اور سوم۔۔ ان واقعات کی تشریح و تاویل/تفسیر (تنقید)۔

یوں ادبی تاریخ کی تشکیل کا عمل ان تینوں عناصر پر مشتمل ہوتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک عنصر کی عدم موجودگی سے ادبی تاریخ کی تشکیل کا عمل مکمل نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل محض ادبی تحقیق یا ادبی تنقید بن کر رہ جاتا ہے۔ ان تینوں عناصر کے علاوہ ایک چوتھی چیز، جو ان تینوں عناصر کو باہم مربوط کر کے بامعنی اندازِ نظر عطا کرتی ہے، وہ ہے، ادبی تاریخ نویسی کا فن/تکنیک، جو ادبی تاریخ کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی فن کی بدولت ہی تاریخ میں نئے معنی و مفاہیم اور تنوع پیدا کرتا ہے اور ماضی کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کا حوصلہ اور قوت فراہم کرتا ہے۔

تاریخ نویسی کے فن/تکنیک کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم یہاں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اُردو ادب کی تاریخ'' کا فنی/تکنیکی اعتبار سے جائزہ لیتے ہوئے دیکھیں گے کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنی ادبی تاریخ کو کن تکنیکوں کے تحت تشکیل دیا ہے۔

اردو ادب کی تاریخوں کا تکنیک کے اعتبار سے جائزہ لیتے ہوئے ہم رام بابو سکسینہ کی کتاب ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' (A History of Urdu Literature) جس کا ترجمہ قابلِ قدر اضافوں کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں مرزا محمد عسکری نے ''تاریخ ادبِ اردو'' کے نام سے شائع کیا، اس ادبی تاریخ سے لے کر آج تک مکمل، نامکمل اور بشمول مختصر ادبی تاریخوں کے، اردو ادب کی تقریباً ۶۰ تاریخیں چھپ چکی ہیں۔ لیکن یہ تمام ادبی تاریخیں شعرا اور نثر نگاروں کی سوانح، اور ان کی خصوصیات کے علاوہ ادبی واقعات کو محض سنہ وار ترتیب دینے تک محدود رہی ہیں۔

اس سلسلے میں عبدالقادر سروری کی ''اردو کی ادبی تاریخ'' (۱۹۵۸ء) اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخِ ادبِ اردو'' (۱۹۷۵ء) اردو ادب کی روایتی تاریخوں سے صرف جدا ہی نظر نہیں آتیں بلکہ درحقیقت یکسر مختلف ہیں۔

عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے ادبی تاریخ نویسی کے نظریات اپنے عہد کے مروجہ رجحان سے بہت مختلف تھے۔ عبدالقادر سروری کے ہاں ادبی تاریخ نویسی نظریہ یہ تھا کہ ''آئندہ ادبی تاریخ لکھنے والوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ادبی مظاہر کو سیاسی، معاشی، سماجی اور فنی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کریں۔'' (۴)

اس طرح سے عبدالقادر سروری اُردو کے وہ پہلے ادبی مؤرخ ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ ادبی تاریخ کو محدود سوانح نگاری اور خصوصیات کے حصار سے نکال کر وسیع سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی تناظر میں مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی اور فرانس میں تاریخ نویسی کے سلسلے میں متنوع تجربات کیے جا رہے تھے، جو فنی اعتبار سے تاریخ نویسی کے دامن کو وسعت اور گہرائی سے ہمکنار کر رہے تھے۔ عبدالقادر سروری کا یہ اقدام اپنی نوعیت کی منفرد کاوش تھا کیونکہ ادبی تاریخ نویسی میں ایسے نظریات اور افکار کا اہتمام اس سے پہلے یہاں نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس بات کا سروری کو بھی علم تھا کہ ''یہ مختصری کتاب اس سعی کا آغاز سمجھی جا سکتی ہے'' (۵) لیکن سروری کی ادبی تاریخ کی طرف بالکل توجہ نہ دی گئی کیونکہ اس عہد میں روایتی ادبی تاریخ نویسی کا انداز اس قدر مستحکم تھا کہ سروری کی ادبی تاریخ کو گیان چند نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ ''یہ مروجہ نوعیت کی تفصیلی تاریخِ ادب نہیں ہے اس میں رجحانات اور محرکات پر زیادہ زور دیا گیا ہے'' (۶)

عبدالقادر سروری کے بعد پروفیسر آل احمد سرور کے ہاں بھی ادبی تاریخ نویسی کے ضمن میں کچھ ایسے افکار و نظریات سامنے آتے ہیں کہ جن سے ان کے ادبی تاریخ نویسی کے شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''اردو کے اس مطالعے کے لیے زبان کی خصوصیات کے علم کے علاوہ تاریخ اور تہذیب کا گہرا شعور اور سماج کے پیچ در پیچ رشتے کا علم اور جمالیات، فلسفے اور معانی و بیان کے ساتھ ان زبانوں کے ادب کا علم بھی ضروری ہے۔ جن سے یہ زبان خاص طور پر متاثر ہوتی ہے۔''(۷)

عبدالقادر سروری کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخِ ادبِ اُردو'' کا منصوبہ منظر عام پر آیا اور ۱۹۷۵ء میں اُن کی ادبی تاریخ کی پہلی جلد طبع ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی ادبی تاریخ نویسی کا نظریہ یوں بیان کرتے ہیں:

''ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں ہم زبان اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی اور تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت، ایک اکائی بناتے ہیں اور تاریخ ادب ان سارے اثرات، روایات اور محرکات اور خیالات اور رجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔''(۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی تاریخ ابھی زیرِ تکمیل تھی کہ بیسویں صدی اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ اگر اس صدی کا احاطہ ادبی تاریخ نویسی کے اعتبار سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی میں ادبی تاریخ نویسی کے دو نظریے کارفرما نظر آتے ہیں۔ ایک نظریہ روایتی انداز کا ہے جبکہ دوسرا نظریہ ادبی تاریخ کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

ادبی تاریخ نویسی کے باب میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اردو ادب کی تاریخ'' (۲۰۰۳ء) ایک نیا تجربہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ادبی تاریخ اُسی تجربے کا فروغ ہے کہ جس کی بنیاد عبدالقادر سروری نے رکھی، تو کچھ مضائقہ نہ ہوگا۔

یہ ادبی تاریخ، کلاسیکی اور روایتی نظریہ ادبی تاریخ کے بالکل برعکس جدید تاریخ نویسی کے نظریات اور افکار سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ادبی تاریخ کا تعلق اس مکتبہ فکر سے ہے جو ادبی تاریخ کو وسیع تناظر میں دیکھنے کا قائل ہے۔ ڈاکٹر تبسم نہ صرف ادبی تاریخ کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں بلکہ وہ ادبی تاریخ کی تعبیر کے لیے جدید علوم جیسے اقتصادیات، فلسفہ اور نفسیات سے بھی استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کہتے ہیں:

''تاریخ میں اب شعبہ جاتی مطالعات (Compartment Studies) کا دور گزر گیا۔ یعنی سماجی تاریخ اب سماجی تاریخ نہیں ہے یعنی کسی خاص عہد کی سماجی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہم دوسرے متعلقہ علوم و فنون سے بھی مدد لیں گے، لہٰذا جب ہم کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے شعبہ تک محدود نہیں رکھیں گے۔ بلکہ اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیو مالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ کی روشنی میں اس دور کا تجزیہ مکمل کریں گے۔''(۹)

ادبی تاریخ ہمیشہ کسی نظریے اور اصول کے تحت تشکیل پاتی ہے کیونکہ ماضی کے اَن گنت واقعات میں سے ادبی مورخ جب واقعات کا چناؤ کرتا ہے تو اس وقت درحقیقت کوئی نظریاتی اساس اُس کے پیشِ نظر ہوتی ہے جس کے تحت وہ واقعات کو ایک خاص ترتیب و تشکیل دیتا ہے ان کی توضیح و تشریح کرتا ہے اور ایک خاص نوعیت کے معنی و مفاہیم عطا کرتا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ''تاریخ کو لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو کسی تھیوریٹیکل (نظریاتی) فریم ورک میں بیان کیا جائے۔ تاریخ اور تھیوری کا اب آپس میں گہرا رشتہ ہو گیا ہے۔''(۱۰)

تاریخ اور تھیوری (نظریہ) کے اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اردو ادب کی تاریخ'' کا جائزہ لیتے ہیں

تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تبسم نے اپنی ادبی تاریخ کو اینلز دبستان (Annales School) کے نظریہ تاریخ کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس نظریے کے بارے میں کہتے ہیں:

''بیسویں صدی میں تاریخ کے تصورات میں انقلابی تبدیلیاں فرانس کے ''اینلز دبستان'' (Annales School) سے شروع ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے اینلز دبستان کے مورخین نے تاریخ کو اس محدود کلاسیکل تصور سے رہائی دلوائی اور اسے ایک وسیع تر معنویت عطا کی۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۸۹ء تک اس دبستان کی سرگرمیوں نے تاریخ کو ایک نئے رنگ وروپ سے سنوارا۔'' (۱۱)

اینلز دبستان نے تاریخ نویسی کو نہ صرف ایک نئے فنِ تاریخ نویسی سے روشناس کیا بلکہ اس کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے تاریخ نویسی کے اصول وضوابط بھی مرتب کیے۔ انیلز دبستان تاریخ نے یورپ، امریکہ اور بالخصوص جرمنی اور فرانس میں بہت فروغ حاصل کیا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ادبی تاریخ کی تفہیم کے لیے اینلز سکول کی تاریخ نگاری (Annales School of Historography) کے نظریات سے آگاہی بنیادی طور پر ضروری ہے۔ سہولت کے پیش نظر اینلز سکول کا تعارف پیش ہے۔

اینلز دبستان (Annales School of Historography) کے آغاز سے پیشتر جرمنی میں لیوپولڈ رانکے (۱۷۹۵ء-۱۸۸۶ء) کے نظریات تاریخ نویسی کے میدان میں انقلاب برپا کر چکے تھے۔ اسی حوالے سے بورکیاڈٹ کے نظریات کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اینلز دبستان اسی فروغ کا نتیجہ تھا جس میں مارک بلوخ (MarcBloch) نے فرانس کے شہر پیرس سے ۱۹۲۹ء کو جرنل اینلز (Journal Annales) کی اشاعت کا آغاز کیا جو بعد میں باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ اس تحریک نے روایتی تاریخ نویسی کو رد کرتے ہوئے یہ کہا کہ ''ایک نئے تازہ اور جدید انداز میں تاریخ کا تجزیہ کیا جائے'' (۱۲) اور اس کے لیے ''تاریخ میں ان تمام سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے جو ایک معاشرے میں رواں دواں ہوتی ہیں تا کہ ایک وسیع کینوس میں انسانی عمل کو سمجھا جا سکے۔'' (۱۳) اینلز دبستان نے سماجی، ثقافتی، سیاسی اور تہذیبی امتزاج سے اس سارے عہد کا مطالعہ ضروری قرار دیا تا کہ انسانی ذہن اور نفسیات کی گہرائیوں کا ادراک کیا جا سکے، کیونکہ اس کے بغیر کامل تاریخ کی تشکیل کا عمل مکمل نہیں ہوتا۔ اس دبستان نے انسانی ذہن اور نفسیات کے ذریعے معاشرتی رویوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔

جدید ادبی تاریخ نویسی کی تشکیل کے عمل میں ادبی مورخ مختلف علوم کا مطالعہ انفرادی سطح پر ایک جہت میں نہیں کرتا بلکہ وہ مختلف علوم کے باہمی تعاون سے اس عہد کی ''روح'' کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری یہ کہتے ہیں کہ ''سماجی تاریخ اب سماجی تاریخ کا نام نہیں ہے یعنی کسی خاص عہد کی سماجی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہم دوسرے متعلقہ علوم وفنون سے بھی مدد لیں گے۔'' (۱۴) کیونکہ یہی وہ اصول ہیں کہ جن سے کسی عہد کے ذہن اور نفسیات کا مطالعہ ممکن ہوتا ہے اور جب تک کسی عہد اور نفسیات کا مطالعہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک اس عہد کے اجتماعی شعور کا ادراک ممکن نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہی اُس عہد کا اجتماعی شعور ہوتا ہے جس کو اس عہد کی روح کہا جاتا ہے۔ جس سے اس عہد کے ظاہری اعمال کے ساتھ ساتھ باطنی فکر وعمل کا سارا نظام عیاں ہوتا ہے۔

تاریخ نویسی کی اسی تکنیک کے تحت ڈاکٹر تبسم کاشمیری اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کا مطالعہ کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کا ہندوستان پر حملہ اور فتح کے بعد ہندوستان پر ہونے والے اثرات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ جب شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کے حالات، مرہٹوں کی یورشوں اور ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دیتے ہوئے اپنے خطوط میں احمد شاہ اور نجیب الدولہ کو

لکھا تھا کہ حملے کے دوران مسلمانوں کا نہ مال لوٹا جائے اور نہ ہی کسی مسلمان کی عزت میں فرق آنے پائے۔لیکن فتح کے بعد ابدالی نے کیا کِیا؟ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان نتائج کا تجزیہ افغان قوم کی اجتماعی نفسیات اور ذہنیت کے حوالے سے کرتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ جیسے نیک انسان اپنی نیک نیتی اور اسلامی قوت کے غلبہ اور احیاء کے جوش میں یہ فراموش کر گئے کہ شمال کے جن پہاڑوں سے وہ امداد کے طالب ہیں ان پہاڑی باشندوں کی بھی ایک سائیکی ہے اور وہ اس کے خلاف نہیں چل سکتے۔طالع آزمائی لوٹ مار اور قتل وخون ان کی سائیکی کے لازمی حصے بن چکے ہیں اور وہ اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔''(۱۵)

اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کی فوج نے شاہ ولی اللہ کی تمام تمناؤں اور خواہشات کے برعکس اور افغان سائیکی کے عین مطابق فتح یابی کے بعد ''پنجاب اور دلی کی معیشت اور مالی اثاثوں کو ہر ممکن حد تک نچوڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور مغلوں کی رہی سہی مالی طاقت بھی اجڑ گئی۔''(۱۶)

یہاں ڈاکٹر تبسم ادبی تاریخ نویسی کی جدید تکنیک ''نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'' کا استعمال کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کے حملے اور اُس کی فتح کے بعد کی دلی اور پنجاب کی تباہی کا جائزہ لیتے ہیں۔وہ ''نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'' کی تکنیک کے مطابق نہ تو مغل خاندان کا ......نہ اُن کی بادشاہت یا اس سلطنت کے امرا اور روسا کا نقشہ کھینچتے ہیں اور نہ وہ ہی فوج کی شکست کے حالات دکھاتے ہیں، بلکہ وہ عام آدمی کی معاشی، معاشرتی بدحالی اور ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی کیفیات اور احساسات کو پیش کرتے ہیں جن سے عام آدمی دوچا ہوا اس طرح معاشرے کے عمومی حالات کا نقشہ کھل کر سامنے آجاتا ہے:

''ابدالی کے اس الم ناک منفی کردار کے باعث عام ذہنوں میں بے بسی، لاچارگی اور شکست کی طاقتوں نے مزید غلبہ پایا۔ستم یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ کے بعد کوئی خواب دیکھنے والا دانش ور بھی باقی نہ رہا اور جو معاشرہ خواب سے بھی محروم ہو جائے اس کی موت پر یقین کر لینا چاہیے۔''(۱۷)

اردو ادب کی تاریخ نویسی میں ''نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'' کی تکنیک کا استعمال پہلی بار ہمیں ڈاکٹر تبسمکے ہاں کی ان کی ادبی تاریخ میں نظر آتا ہے۔حالانکہ یہ نظریہ یورپ اور امریکہ میں ایک وقت بہت مقبول ہوا تھا جب ۱۹۶۶ء میں ایڈورڈ ٹامپسن نے ''ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ'' میں نیچے سے ابھرتی ہوتی تاریخ کی اہمیت کے بارے میں آرٹیکل لکھا تھا۔(۱۸)اس نظریے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۶ء کے بعد اس نظریہ کے اتباع میں یورپ اور امریکا میں کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کی گئیں۔

دراصل معاملہ کچھ یوں ہے کہ اس سے پہلے تاریخ کو صرف بڑے آدمیوں کے کارناموں کا مرقع سمجھا جاتا تھا۔''ٹامپسن نے نہ صرف ان مسائل کی نشان دہی کی جن سے ماضی میں عام آدمی دوچار رہا بلکہ یہ بھی کہ ان تجربات کی روشنی میں عام آدمیوں کی زندگی کی کس طرح سے تاریخ میں تشکیل نو کی جائے۔''(۱۹)

اب ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے اُن جملوں کو ایک بار پھر دہراتے ہیں جن میں ڈاکٹر تبسم، اٹھارویں صدی کے پُر آشوب عہد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ستم یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ کے بعد کوئی خواب دیکھنے والا دانش ور بھی باقی نہ رہا اور جو معاشرہ خواب سے بھی محروم ہو

جائے اس کی موت پر یقین کر لینا چاہیے۔'' (۲۰)

یہ جملے ایک طرف براہِ راست اس عہد کی اجتماعی پژمردگی کی علامت بن جاتے ہیں جو اس معاشرے کی ذہنی، نفسیاتی اور تہذیبی پسماندگی کا احاطہ کرتے ہیں تو دوسری طرف اس عہد کا عصری المیہ بھی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ جملے ادبی مورخ کی تنقیدی بصیرت کا بھی اظہار ہیں۔ ادبی تاریخ، درحقیقت ادبی مورخ کی گہری تنقیدی بصیرت کا تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ تنقیدی شعور کے بغیر ادبی تاریخ واقعات کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے۔ تاریخ میں جب ہم اٹھارویں صدی کے عہد کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ ذہنی اور نفسیاتی اسباب تھے جو دبستان دلی کے داخلی اور خارجی عناصر کو مرتب کر رہے تھے۔ ڈاکٹر تبسم ان ظاہری اسباب کو معاشرے کے باطنی احساسات اور کیفیات کے ساتھ منطبق کر کے دیکھتے ہیں جس کا منطقی نتیجہ بالخصوص شاعری میں ہمیں دبستانِ دلی کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ جب ڈاکٹر تبسم ان داخلی عناصر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اٹھارویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ، ذات کی شکستگی، فنا، یاس اور ناامیدی کا اجتماعی تجربہ کر رہا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر کی شاعری کی فضا کو ان ہی عوامل نے تشکیل دیا ہے۔

''آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز جو ہاتھ سو گیا ہے سر ہانے دھرے دھرے'' (۲۱)

محولہ بالا تمام اقتباسات جو شاہ ولی اللہ سے احمد شاہ ابدالی اور اٹھارویں صدی کے ہندوستانی معاشرے کے بارے میں پیش کیے گئے، یہ درحقیقت ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ادبی تاریخ کی مسلسل عبارت ہے۔ اس عبارت کو مختلف اقتباسات میں تقسیم اس لیے کیا گیا تاکہ ان فنی حربوں/تکنیکس کو نمایاں کیا جا سکے جو ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنی ادبی تاریخ کی تشکیل میں استعمال کیے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے اس سارے مطالعے کے تناظر میں اب ہم اگر میر کی شاعری کے فکری اور نفسیاتی اجزا کو باہم مربوط کریں تو اس عہد کی تاریخ نظر آئے گی اور اگر ان اجزا کو الگ الگ دیکھیں، تو میر کی شاعری۔ ادبی تاریخ نویسی میں ادبی مؤرخ کا کمال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ تمام سماجی علوم، ادب اور سماج کو ایک نقطے پر مرتکز کر دیتا ہے۔

ادبی تاریخ نویسی کا یہی وہ پہلو ہے کہ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ''تاریخ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے انسانی ذہن، رجحان، عادات اور اس کے عمل ورد عمل کو سمجھا جائے'' (۲۲) اور علمِ تاریخ کو سمجھے بغیر فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات یا ادب کو مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔'' (۲۳)

جدید مؤرخین ایڈورڈ ٹامپسن، کارلو گنز برگ، لادوری اور دوسرے کئی مورخین نے تاریخ نویسی میں، تاریخ کے شعور اور مشاہدہ کے لیے قوتِ متخیلہ کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ''اس بات کی نشان دہی کی کہ کس طرح تاریخ نویسی میں تخیل کی مدد سے تاریخ کے فکری پہلوؤں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے اور کس طرح دستاویزات سے کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں۔'' (۲۴) اس طرح قوتِ متخیلہ کی مدد سے ماضی کے عمیق پہلوؤں سے معنی اور مفاہیم کا استخراج کیا جا سکتا ہے

ادبی تاریخ نویسی میں قوتِ متخیلہ کی افادیت اور اہمیت، اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ ادب کی تعبیر و تشریح کا بہت زیادہ انحصار اسی قوتِ متخیلہ کے بل بُوتے پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ادبی تاریخ کی تشکیل میں قوتِ متخیلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''ادبی مورخ کا متخیلہ نہایت تیز ہونا چاہیے اس کا متخیلہ بے جان ماضی میں روح ڈال دیتا ہے۔ ساکن زمانوں کو

متحرک کر دیتا ہے اور سوئی ہوئی مجلسوں میں روح ڈال دیتا ہے۔''(۲۵)

تاریخ نویسی میں قوتِ متخیلہ کی اہمیت کو جاننے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متخیلہ کا استعمال کب، کیسے اور کہاں کیا جائے؟ اس کا جواب متخیلہ کی تکنیک سے ہے۔

عام طور پر متخیلہ کے استعمال کے سلسلے میں دو تکنیکوں کا استعمال معروف ہے۔ اِن میں سے ایک تکنیک فوٹو گرافیکیے اور دوسری مشاہداتی۔ فوٹو گرافیکی تکنیکلے تحت مورخ، واقعات کی ہو بہو تصویر پیش کرتا ہے ''اس حیثیت سے مورخ کی مثال ایک فوٹو گرافر کی ہو جاتی ہے'' (۲۶) اور مشاہداتی تکنیک میں ادبی مورخ واقعات کی معنویت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ جیسے وہ مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے۔

لیکن ادبی تاریخ میں متخیلہ کا استعمال ان تکنیکوں سے جدا ہوتا ہے جیسے ادبی تاریخ نویسی میں متخیلہ کی ایک مثال ''آبِ حیات'' کے وہ مرقع ہیں جہاں ماضی کے کردار متحرک صورت میں ملتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے ہاں متخیلہ کی تکنیک کا تجربہ ادبی مورخین سے جدا نظر آتا ہے۔ یہاں وہ متخیلہ کے استعمال میں ''آبِ حیات'' کا انداز اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری متخیلہ کی مدد سے ماضی کو زندہ اور متحرک بنا دیتے ہیں جس میں ماضی کے کردار حقیقی انداز میں افعالِ زندگی سرانجام دیتے نظر آنے لگتے ہیں۔ جیسے:

''ستمبر ۱۶۸۷ء کو صبح کے تین بجے گولکنڈہ کے قلعہ میں رقص و سرور کی محفل ابھی بپا تھی کہ اچانک شور اٹھا، ''مغل افواج قلعہ کے اندر داخل ہو گئی ہیں۔'' ایسے نازک وقت میں ایک آواز بلند ہوئی۔ گائے جا جو لمحہ مسرت میں صرف ہو جائے وہ اچھا ہے۔'' یہ آواز گولکنڈہ کے آخری تاج دار ابوالحسن تانا شاہ کی تھی۔''(۲۷)

''نذیر کی پیٹھ کبڑی ہو چکی تھی، تن سوکھ چکا تھا اور وہ گھوڑے پر زین رکھنے کی تیاریوں میں لگا رہتا تھا۔ فالج زدہ نظیر پانچ برس تک اپنی موت کا منتظر رہا۔ اس کے صبح و شام گھر کی چار دیواری میں نیم اور بیری کے دو پیڑوں کے نیچے بوریے پہ بیٹھے بیٹھے گزر جاتے تھے۔ یہ پیڑ ہی اس کا ڈرائنگ روم تھے جن کے سائے تلے وہ احباب سے بات چیت کرتا تھا، روایت ہے کہ اِن ہی پیڑوں تلے یکم اگست ۱۸۳۰ء کو اُس کا شعری سفر اختتام پذیر ہوا۔''(۲۸)

ادبی تاریخ نویسی کی حدود، دائرۂ کار اور تاریخ کے منظر نامے کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے کہ شعرا اور ادبا کے معیارات کا تعین اور ان کی صف بندی، مرکز سے دور نئی ادبی کڑیوں کی تحقیق و دریافت ان کو ادبی تاریخ کے دھارے میں شامل کرنے کے مسائل۔

ان تمام سوالات کے جوابات کے سلسلے میں ہمیں تاریخ نویسیکے بنیادی اصول کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ تاریخ ہمیشہ ''مین سٹریم'' پر سفر طے کرتی ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

ادبی تاریخ صرف ان شخصیات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہے جو ماضی میں رجحان سازی، عہد سازی اور اثر اندازی کے اعتبار سے قابلِ ذکر مقام رکھتی ہوں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری، تاریخ نویسی کے اسی نظریہ اور اصول کی سختی سے پابندی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی ادبی تاریخ کو تاریخ کے مرکزی دھارے (مین اسٹریم) پر استوار رکھتے ہیں۔ جس دھارے پر تاریخ کا سیاسی اور عسکری، لسانی اور علمی و ادبی قافلہ رواں دواں رہا تھا۔

یوں نظر آتا ہے کہ ڈاکٹر تبسم تاریخ کے اس قافلے کے تعاقب میں سفر کرتے ہیں۔ جو قافلہ پنجاب سے دہلی کی جانب روانہ ہوا تھا۔ تاریخ کا یہ قافلہ جہاں پڑاؤ ڈالتا ہے، ڈاکٹر تبسم وہی تاریخ کا لسانی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے مشاہدہ کرنے لگ جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ وارث سرہندی، ''علمی اردو لغت'' (لاہور: علمی کتاب خانہ، س۔ن)

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''تاریخ اور فلسفہ تاریخ''، (لاہور: فکشن ہاوس، ۱۹۹۳) ص ۵۷

۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۱۰

۴۔ عبدالقادر سروری، ''اردو کی ادبی تاریخ'' (حیدرآباد: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۸ء) ص ۵۔۶

۵۔ عبدالقادر سروری، ''اردو کی ادبی تاریخ'' (حیدرآباد: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۸ء) ص ۵

۶۔ گیان چند، ڈاکٹر، ''اردو کی ادبی تاریخیں'' (دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۰ء) ص ۲۱۵

۷۔ آلِ احمد سرور، ''علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو'' (مقدمہ) جلد اول، بحوالہ ''اردو کی ادبی تاریخیں''، ڈاکٹر گیان چند، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء) ص ۱۹

۸۔ جمیل جالبی، ''تاریخ ادبِ اردو'' جلد اول، (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۴ء) ص ۱۱۔۱۲

۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۹

۱۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر (مرتب) ''برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات'' (کراچی جامعہ: پاکستان اسٹڈیز سینٹر، ۲۰۰۷ء) ص ۹۱

۱۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۹

۱۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر ''تاریخ شناسی'' (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء) ص ۱۱۴

۱۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر ''تاریخ شناسی'' (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء) ص ۱۱۴

۱۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۹

۱۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۲۵۴

۱۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۲۵۷

۱۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۲۵۴

۱۸۔ جم شارپ، ''نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'': ڈاکٹر مبارک علی، (مترجم) مجلّہ تاریخ (لاہور: فکشن ہاوس، ۱۹۹۹ء) ص ۸

۱۹۔ جم شارپ، ''نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'': ڈاکٹر مبارک علی، (مشمولہ) مجلّہ تاریخ (لاہور: فکشن ہاوس، ۱۹۹۹ء) ص ۹

۲۰۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۲۵۴

۲۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۲۵۵

۲۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''تاریخ اور فلسفہ تاریخ'' (لاہور: فکشن ہاؤس، طبع چہارم، ۲۰۰۵ء) ص ۳۹

۲۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''تاریخ اور فلسفہ تاریخ'' (لاہور: فکشن ہاؤس، طبع چہارم، ۲۰۰۵ء) ص ۴۹

۲۴۔ جم شارپ، ''نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'': ڈاکٹر مبارک علی، (مترجم) مجلّہ تاریخ (لاہور: فکشن ہاوس، ۱۹۹۹ء) ص ۲۰

۲۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۱۱

۲۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''تاریخ اور فلسفہ تاریخ'' (لاہور: فکشن ہاؤس، طبع چہارم، ۲۰۰۵ء) ص ۴۵

۲۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۲۱۵

۲۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۵۹۶

۲۹۔ جمیل جالبی، ''تاریخ ادبِ اردو'' جلد اول، (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۴ء) ص ۵۸۵